مقالات

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی)

مترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزانِ حق و عدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کرسکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وہ قدرت بیان عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کردوں کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہ جائے۔ بعد ازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابرین ملت کے درمیان اختلاف کی —— خاص کر احکام فقہیہ میں اختلاف کی —— وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور سائل کی قوت فہم و حفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن ان حقائق کا، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے، ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہوگیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہوگیا جس کا نام میں نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" رکھا۔

دورِ نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدوّن نہیں تھی، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کرکے ایک ایک چیز کے علیحدہ علیحدہ ارکان و شرائط اور آداب، دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جاسکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں، اور جن کا حصر بیان کیا جاسکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذلک۔ اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقۂ وضو دیکھ کر اسے اختیار کرلیتے۔ بغیر اس کے کہ حضور اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپکے نماز پڑھنے کا ڈھنگ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے۔ آپ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپکے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے۔ الغرض آنحضرت صلعم کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا۔ آپ نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ، اور نہ کبھی آپنے یہ خیال کیا کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے اس لیے اس طرح کے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے۔ اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے۔ دوسری طرف اصحاب رسول کا بھی حال یہ تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے

متعلق آنحضرت صلعم سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا۔ انھوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ (اے نبی یہ لوگ تم سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔) اور يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ (تم سے حالت حیض کے احکام پوچھتے ہیں) وغیرہ۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ "صحابہ صرف انہی مسائل کو پوچھتے تھے جو ان کے لیے نفع رساں ہوتے۔" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "کسی ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو کیونکہ میں نے عمرؓ بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو اس طرح کے سوالات کرے۔" قاسمؒ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "تم لوگ ایسی چیزوں کی بابت سوال کرتے ہو جن کی بابت ہم نے کبھی زبان استفسار نہیں کھولی۔ نیز تم ایسی باتوں کی کھود کرید کرتے ہو جن کے متعلق مجھے کوئی علم و واقفیت نہیں، اور اگر ہم کو ان کے بارے میں کوئی علم ہوتا تو (حسب زمان نبویؐ[1]) ہم تمھیں ضرور بتا دیتے۔" عمر بن اسحاق کا قول ہے کہ "مجھ کو آدھے سے زائد اصحاب رسول سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اس گروہ سے بڑھ کر کسی گروہ کو اونچ بینچ سے خالی اور تشدد سے مجتنب نہیں پایا۔" عبادہ بن نسر کندی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کو غسل کیونکر دیا جائے گا؟" آپ نے جواب دیا کہ "میں ایسے لوگوںؓ[2] سے ملا ہوں جو تمھاری طرح تشدد نہیں کرتے تھے نہ تم لوگوں کی طرح (فرضی) مسائل کے متعلق سوالات کرتے تھے۔"

(ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے)

الغرض آنحضرت صلعم کے زمانہ میں استفتاء اور افتا کا دستور صرف یہی تھا کہ لوگ پیش آمدہ واقعات کے متعلق آپ سے استفسار کرتے اور آپ ان کا حکم بیان فرما دیتے۔ اسی طرح معاملات و مقدمات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ ان کا فیصلہ کر دیتے۔ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی مدح و منقبت فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے

شیخین کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ساری باتیں بالعموم اجتماع عام میں ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ جب حضرات شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کو کسی مسئلہ میں حکم شریعت معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی (یا نانی) کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس کے حصہ کے بارے میں رسول اللہ کا کوئی ارشاد نہیں سنا ہے، اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں۔" جب نماز ظہر آپ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟" مغیرہؓ ابن شعبہ نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا ہے" پوچھا "کیا سنا ہے؟" جواب دیا کہ "رسول خدا نے جدہ کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے" حضرت ابوبکرؓ نے پھر پوچھا "یہ بات تمھارے سوا اور کسی کو بھی معلوم ہے؟" محمد بن سلمہؓ نے کہا "مغیرہؓ صحیح فرماتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو (جس کا معاملہ پیش تھا، اس کے پوتے یا نواسے کے

---

[1] آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ اس عالم کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام ٹھونس دی جائے گی جو کسی چیز کا علم رکھتا ہو مگر پوچھنے والے کو بتانے سے انکار کرے۔

[2] مراد صحابہ کرام سے ہے۔ (مترجم)

ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دے دیا۔ اسی طرح "غرہ"[1] (جنین کے خوں بہا) کے بارے میں حضرت عمرؓ کا عام لوگوں سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہ کی روایت پر عمل پیرا ہونا اور وبا[2] کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بیان کردہ ارشاد نبوی کے مطابق فیصلہ کرنا۔ مجوسیوں[3] کے معاملہ میں (بھی) عبدالرحمٰن ابن عوف کی بیان کی ہوئی حدیث پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھنا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا معقل بن یسار کی روایت، جو ان کی رائے کے بالکل مطابق نکلی[4] سن کر خوش ہونا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کا فاروق اعظم[5] کے دروازے سے واپس جانے کے بعد ان کا ابو موسیٰ سے اس حدیث کا دریافت کرنا جس کی بنا پر وہ ان کے دروازہ سے واپس چلے گئے تھے، اور پھر حضرت ابو سعید کا حضرت ابو موسیٰ کے حق میں شہادت دینا وغیرہ بے شمار واقعات مشہور و معروف اور صحیحین اور سنن کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بنائے اختلاف

مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مبارک بالعموم یہی تھا کہ آپ مسائل و احکام شرع مجامع عام میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اب ہر صحابی نے آپ کی عبادت کے انہی طریقوں، آپکے انہی فتووں اور فیصلوں کو یاد کر لیا جن کو اسے دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہوا، پھر ان میں سے ہر حکم کی قرائن حال پر نظر ڈال کر علت متعین کی اور موقع و محل کے ان قرائن و علامات کو سامنے رکھکر جو اس کے نزدیک تعیین علت و مقصد کے لیے کافی اور اطمینان بخش تھے اس نے کسی حکم کو اباحت پر محمول کیا، کسی کو استحباب پر اور کسی کو نسخ پر۔ اس باب میں ان لوگوں کا اعتماد صرف اپنے اطمینان قلب اور شرح صدر پر تھا، استدلال کے (پر پیچ منطقیانہ) طریقوں سے ان کے ذہن آشنا نہ تھے جیسا کہ تم دیہاتی باشندوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگوؤں کا مدعا سمجھ جاتے ہیں (ان گفتگوؤں کے دوران میں استعمال کیے ہوئے) اشارات و کنایات اور تصریحات سے ان کے دلوں کو فہم مطالب کے سلسلے میں اس طرح طمانیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

---

[1] حضرت عمرؓ کے سامنے جنین کے خوں بہا کا مسئلہ آیا تو چونکہ آپ کو اس بارے میں کوئی نص شرعی معلوم نہ تھی اس لیے آپ نے صحابہ سے مشورہ اور استفسار کیا۔ مغیرہ ابن شعبہ نے فرمایا کہ "پیغمبر صلعم نے اس کا خوں بہا 'غرہ' مقرر کیا ہے۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔

"غرہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، یا جنین کے ولی کو پچاس دینار یا پانچ سو درہم دیے جائیں۔

[2] حضرت عمرؓ کے واقعۂ سفر شام کی طرف اشارہ ہے جبکہ آپ شام پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر لیے جا رہے تھے اور راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آکر یہ روایت بیان کی کہ آنحضرت نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

[3] حضرت عمر اپنے زمانۂ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے یہ بتایا کہ آنحضرت ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو آپ نے بھی ان پر جزیہ لگا دیا۔ [4] یہ ایک ایسی عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر اس حال میں مر گیا تھا کہ ابھی نہ تو اس نے اس کا مہر مقرر کیا تھا نہ اس سے مقاربت کی تھی۔ اس واقعہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ [5] حضرت ابو موسیٰ حضرت عمرؓ کے دروازے پر گئے اور جب تین بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب اندر سے نہ ملا تو واپس چلے، چند قدم گئے ہوں گے کہ حضرت عمر نے خادم سے کہا کہ ان کو اندر بلالو، مگر خادم نے باہر آکر ابو موسیٰ کو دروازہ پر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکار کر بلوایا اور واپس جانے کی علت پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ "جب تین آوازیں دینے کے باوجود اجازت نہ ملے تو دروازہ سے ہٹ جاؤ"۔ حضرت عمر نے کہا کہ اپنی اس روایت پر کوئی گو[illegible] ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ چنانچہ جب حضرت ابو سعید خدریؓ نے ابو موسیٰ کی توثیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم کر لیا۔ (مترجم)

آغازِ اختلاف عہدِ رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد یہ حضرات مختلف اطراف و ممالک میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ خطۂ ارض میں عوام کا رہنما بن گیا۔ اب ان کے سامنے زندگی کے بے شمار واقعات اور مسائل پیش ہونے شروع ہوئے جن میں ان سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ ہر صحابی ان کے جواب میں اپنی مخصوص معلومات یا اپنے استنباط کے مطابق جوابات دیتا۔ اگر اس کو اپنے ذخیرۂ معلومات و استنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی تھی اور جس مقام پر اس کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم لگا دیتا۔ مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول خدا صلعم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اب یہاں سے ان کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوتا ہے جس کی مختلف بنیادیں تھیں :-

(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف ایک یہ کہ ایک صحابی نے رسول اکرم سے کسی معاملہ کا فیصلہ یا کوئی فتویٰ سن رکھا تھا لیکن دوسرا اس سے نابلد تھا اس لیے اس نے اس امر میں اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ پھر اس کی بھی چند صورتیں تھیں

اولاً یہ کہ یہ اجتہاد حدیث نبوی کے عین مطابق نکلا۔ جس کی مثال وہ روایت ہے جس کو امام نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے ایک ایسی عورت کے (حق مہر وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا گیا جسکا شوہر مہر مقرر کرنے اور اس سے مقاربت کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا، آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملہ میں پیغمبر صلعم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ مہینہ بھر ان کے ہاں آتے اور اصرار کرتے رہے کہ کوئی حکم بیان کر دیں۔ تب انھوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ دے دیا کہ اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیے جتنا اس کی ہم مرتبہ عورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ، نیز اس کو عدت گزارنی ہوگی اور شوہر کے ترکہ میں سے حصہ پائے گی۔ یہ سن کر معقل بن یسارؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ویسا ہی حکم دیا تھا۔" حضرت ابن مسعودؓ کو یہ معلوم کر کے اتنی مسرت ہوئی کہ شرف باسلام ہونے کے بعد سے اب تک ایسی مسرت ان پر کبھی بھی نہ طاری ہوئی تھی۔

ثانیاً یہ کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس سلسلہ میں اس طریقہ سے کوئی حدیث نبوی سامنے آئی جس سے اس کی صحت کا ظن غالب ہوتا تھا۔ اس لیے مجتہد نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث رسول کو اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر اس روایت کو لے لو جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کا خیال تھا کہ جو شخص طلوع صبح کے وقت جُنبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا، لیکن جب کچھ ازواج مطہرات نے رسول اللہ کا عمل اس خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو پہنچی مگر ایسے قابل اطمینان طریقے سے نہیں پہنچی کہ اس کے صحیح ہونے کا گمان غالب ہوتا، اس لیے مجتہد نے حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے اپنے اجتہاد ہی پر عمل کیا۔ اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول (یعنی صحاح ستہ کے مولفین) نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ "فاطمہ نے حضرت عمرؓ کے روبرو ذکر کیا کہ "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، رسول اللہ صلعم نے نہ تو مجھ کو زمانہ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان۔" آپ نے اس کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ "ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب الٰہی کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

(حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ تین طلاقیں پانے والی عورت کو نفقہ بھی ملنا چاہیے اور قیام گاہ بھی۔ نیز فاطمہ بنت قیس کے قول "لا نفقۃ لہا و لا سکنیٰ" کو سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی"۔

دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ "عمرؓ بن خطاب کا خیال تھا کہ اگر جُنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہم سفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہو گئی۔ لیکن پانی نہ پا سکا، اس لیے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا، (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا۔ ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھیری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقہ میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہو گئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا اس لیے لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

رابعاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو حدیث سرے سے پہنچی ہی نہیں۔ مثلاً مسلم کی یہ روایت کہ "حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سروں کے بال کھول لیں۔ حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ تعجب ہے ابن عمر پر کہ وہ عورتوں کو بال کھول ڈالنے کا حکم دیتے ہیں! اگر ایسا ہی ہے تو سیدھے سے یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ عورتیں اپنے سر ہی منڈا ڈالیں! حالانکہ میں اور رسول اللہ صلعم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور میں اپنے بالوں کے معاملہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی کہ ان پر تین بار پانی بہا دیتی تھی (اور کبھی ان کو کھولتی نہیں تھی)

دوسری مثال امام زہری کے بیان کردہ اس واقعہ میں ہے کہ "ہندکو یہ اطلاع نہ تھی کہ آنحضرتؐ نے مستحاضہ کو استحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور (ترک نماز کے غم سے) رویا کرتیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۰) لہ قرآن مجید کی آیت وَلَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ اور آیت اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو زمانہ عدت تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے بلکہ شوہر پر لازم ہے کہ اتنے وقت کے لیے اس کے لیے مکان مہیا کرے۔ پھر آیت وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عورت کو زمانہ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیے۔ یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل مطلق اور عام ہیں، ان میں طلاق رجعی والی عورت کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے، اس لیے ان کا حکم ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کے حق میں عام اور نافذ العمل ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کر دی کیونکہ وہ آیات قرآنی کے خلاف پڑتی تھی۔

یہیں سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی۔ ظاہر ہے فاطمہ صحابیہ تھیں۔ اصول حدیث کی رو سے "الصحابۃ کلھم عدول" سے خارج نہ تھیں، لیکن اس کے باوجود جب قرآن کے عبارت و مفہوم سے ان کی روایت ٹکرائی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ احادیث میں صرف سند ہی قابل لحاظ شے نہیں ہے بلکہ متن بھی دیکھا جانا چاہیے۔ سند بالکل سلسلۃ الذہب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حدیث میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ سند کی صحت، صحت حدیث کو مستلزم نہیں۔ آخر فاطمہ بنت قیس کی روایت میں ضعف اسناد کا کون سا احتمال تھا۔ (مترجم)

(۲) فعل رسول کی تعیین نوعیت میں اختلاف

اختلاف صحابہ کی دوسری اساس یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کام کرتے تو سب نے دیکھا (مگر افکار بشری میں فطری تفاوت کی وجہ سے اس فعل کی نوعیت کی تعیین میں اختلاف ہو گیا) پھر کسی نے تو اس فعل رسول کو عبادت سمجھا اور کسی نے اس کو صرف اباحت پر محمول کیا۔ مثلاً "تحصیب" یعنی سفر حج میں ابطح (نامی وادی مکہ) میں آنحضرت کا اترنا۔ اس کو اصحاب اصول نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم اس جگہ نزول فرما ہوئے تھے مگر یہ نزول حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عمرؓ کے نزدیک بحیثیت عبادت تھا، اس لیے یہ لوگ اس کو حج کی سنتوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے خیال میں اترنا محض بطور اتفاق تھا نہ کہ کسی سنت کی ادائگی کی حیثیت سے۔

دوسری مثال:۔

"جمہور کے نزدیک خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت رَمَل، یعنی اکڑ کر چلنا سنت ہے، لیکن حضرت ابن عباس کا فرمانا یہ ہے کہ نبی صلعم نے جو رمل کیا تھا وہ محض اتفاقی طور پر اور عارضی سبب سے تھا، یعنی مشرکین مکہ کا یہ طعن کہ "مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے بالکل چور کر ڈالا ہے۔" (اسی طعن کے جواب میں پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا وقتی حکم دیا تھا ورنہ) یہ فعل حج کی کوئی مستقل سنت نہیں ہے۔

(۳) وہم تعبیر کا اختلاف تیسری اساس اختلاف یہ ہے کہ افعال رسول کے بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف گمانوں سے کام لیا۔ مثلاً:۔

"رسول خدا صلعم نے حج ادا فرمایا اور تمام صحابہ نے اس کا مشاہدہ کیا، لیکن اس حج کی نوعیت بیان کرتے وقت کسی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے حج تمتع[1] کیا تھا، کسی نے کہا آپ نے حج قران[2] ادا کیا تھا اور کسی کا خیال یہ تھا کہ آپ کا حج حج افراد[3] تھا۔"

دوسری مثال، حضرت سعیدؓ ابن جبیر کی روایت، جس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ:۔

"میں نے (حضرت سعیدؓ نے) عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اے ابوالعباسؓ! اس اختلاف کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوتی ہے جو رسول اللہ صلعم کے احرام حج باندھ لینے کے بعد تلبیہ[4] کرنے کے متعلق اصحاب رسول میں موجود ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے صرف ایک ہی حج ادا فرمایا اس لیے لوگوں میں اس کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہو گیا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم حج کی خاطر مدینہ سے چلے اور جب مسجد ذی الحلیفہ میں آپ نے دوگانۂ احرام ادا فرمایا تو اسی جگہ حج کا احرام باندھا اور فوراً تلبیہ کہا۔ اس تلبیہ کی آواز کچھ لوگوں کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے اس کو یاد کر لیا۔ اس کے بعد آپ اونٹنی پر سوار ہو گئے، جب اونٹنی آپ کو لے کر اٹھی تو آپ نے پھر تلبیہ کیا اور اس تلبیہ کو بھی کچھ دوسرے لوگوں نے سنا۔ بات یہ تھی کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت رسالت میں چلے آتے

[1] حج تمتع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی حج کے مہینوں میں جا کر عمرہ ادا کرے اور سر منڈا کر احرام کھول دے۔ پھر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو از سر نو حج کا احرام باندھے اور حج ادا کرے۔ [2] قران کی شکل یہ ہے کہ آدمی عمرہ اور حج دونوں کا احرام بیک وقت باندھے اور دونوں کو ادا کر کے احرام کھول دے۔

[3] افراد مطلق حج ادا کرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

[4] تلبیۂ حج یہ ہے:۔ لبیک، اللھم لبیک، لبیک، لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لاشریک لک۔ (مترجم)

تھے، سو جب ایک گروہ نے اونٹنی کے کھڑے ہونے کے وقت آپ کو تلبیہ کرتے سنا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ رسول اللہ صلعم نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب ناقہ آپ کو لے کر اٹھی۔ پھر آنحضرت اس جگہ سے آگے بڑھے، جب بیدا (نامی مقام) کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے پھر تلبیہ کیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کو یہ تلبیہ کرتے ہوئے سنا اور یہ خیال کر بیٹھے کہ آپ نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب بیدا کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ حالانکہ بخدا آپ نے اپنی جائے نماز ہی پر حج کی نیت کر لی تھی اور جب آپ کو لے کر اونٹنی کھڑی ہوئی اس وقت بھی آپ نے تلبیہ کیا اور جب بیدا کی بلندی پر چڑھے اس وقت بھی کیا۔

(۴) سہو و نسیان کا اختلاف اختلاف صحابہ کی چوتھی اساس سہو و نسیان ہے۔ جس کی مثال حضرت ابن عمرؓ کے متعلق اس روایت میں موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ابن عمرؓ کو سہو ہو رہا ہے (آنحضرت نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا)

(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف پانچویں اساس، ارشاد نبوی کے مقصود کے فہم و ضبط کا اختلاف ہے۔ مثلاً جب حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت بیان کی کہ "میت کے پسماندگان کے نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا کہ "ابن عمرؓ نے ارشاد رسالت کو اس کے اپنے صحیح موقع و محل اور مدعا کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک یہودی عورت کی قبر سے گزرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ و ماتم کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔"

(دیکھو کہ واقعہ کس طرح ایک خاص میت سے متعلق تھا لیکن قول رسول کے اس خصوصی محل کو ذہن سے نکال دینے کے باعث ابن عمرؓ اعزہ کی گریہ وزاری ہی کو میت پر عذاب کی علت گمان کر بیٹھے اور اس بات کو انھوں نے ہر میت کے لیے ایک عام اصول کی حیثیت دیدی۔

(۶) تعیین علت کا اختلاف چھٹی اساس صحابہ کا احکام شرع کی تعیین علت میں مختلف الخیال ہو جانا ہے۔ جیسے جنازہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا مسئلہ۔ بعض صحابہ کا کہنا یہ ہے کہ ایسا فرشتوں کی تعظیم میں کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ ہر جنازہ کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں) تو اس خیال کے مطابق ہر جنازہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے، خواہ مومن کا جنازہ ہو یا کافر کا۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ یہ قیام، موت کے ہول کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں بھی یہ حکم قیام ہر جنازہ کے لیے عام ہوگا۔ لیکن کچھ حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت صلعم کے قریب سے گذرا تو آپ کو اس بات سے تنفر ہوا کہ ایک یہودی لاش میرے سر سے اونچی ہو کر گذرے، اس لیے آپ کھڑے ہو گئے۔ اگر اس علت قیام کو صحیح مانا جائے تو یہ قیام صرف جنازۂ کفار کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۷) مطابقت احکام مختلفہ میں اختلاف ساتویں اساس، صحابہ کا وہ اختلاف رائے ہے جو دو مختلف احکام شرع کے درمیان مطابقت دینے میں پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ جنگ خیبر کے موقع پر آنحضرت نے متعہ کی اجازت دی، بعد میں اس کی ممانعت کر دی، پھر جنگ اوطاس کے زمانہ میں دوبارہ یہ رخصت عطا فرمائی، اس کے بعد پھر اس سے روک دیا۔ اب حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ اجازت دی گئی تھی اور جب ضرورت جاتی رہی تو یہ اجازت بھی واپس لے لی گئی، مگر حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ لیکن جمہور کا یہ کہنا ہے کہ یہ رخصتِ متعہ بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال:۔

"رسول اکرم صلعم نے استنجا کرتے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے متعلق بعض صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم بالکل عام اور غیر منسوخ ہے۔ لیکن حضرت جابرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب کرتے دیکھا۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ آپ کے اس فعل نے اس پہلی ممانعت کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت کو قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کرکے قضائے حاجت فرماتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے آنحضرت کے اس فعل سے ان لوگوں کے قول کی تردید فرمائی (جو کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف پشت کرکے استنجا کرنا شرعاً ممنوع ہے) پھر کچھ لوگوں نے دونوں روایتوں کو برابر لانے کی سعی کی۔ سو شعبی وغیرہ نے یہ رائے قائم کی کہ نہی کھلے میدانوں سے مخصوص ہے۔ ورنہ اگر آدمی پاخانہ کے اندر ہو تو اس کے لیے قبلہ کی طرف پشت یا رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور بعض دوسرے حضرات اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرت کا قول (جس میں نہی موجود ہے) اپنی جگہ بالکل قائم و ثابت ہے اور اس کا حکم عام ہے۔ رہ گیا آپ کا فعل، سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے مخصوصات میں سے ہو، اس طرح یہ فعل، ارشاد نبوی کا نہ تو ناسخ ہوگا نہ مخصص۔

عہد تابعین الغرض اس طرح صحابہ کرام کے مذاہب مختلف ہو گئے۔ پھر یہی اختلافات وراثتاً تابعین تک پہنچے۔ ہر تابعی کو جو کچھ مل سکا اسی کو اس نے اپنا لیا اور آنحضرت کی جو حدیثیں اور صحابہ کے جو مذاہب اس نے سنے ان کو محفوظ اور ذہن نشین کر لیا۔ اور جو مختلف اقوال اس کے سامنے آئے اس نے اپنی فہم کی حد تک ان میں مطابقت پیدا کی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض اقوال ان کی نگاہوں میں بالکل ہی ناقابل اعتنا ہو کر رہ گئے، اگرچہ وہ اجلۂ صحابہ سے مروی تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ و ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ جنابت کے لیے تیمم نہیں ہے۔ تابعین تک پہنچا مگر ان احادیث کی بنا پر ان کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا، جو عمارؓ اور عمران بن حصین وغیرہ اصحاب سے مروی ہو کر مشہور ہو چکی تھیں۔ پس اس حالت میں قدرتی طور پر علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا علیحدہ مذہب ہو گیا اور مختلف شہروں میں مختلف ائمہ کی علیحدہ علیحدہ امامتیں قائم ہو گئیں۔ مثلاً مدینہ میں سعید ابن مسیب اور سالم ابن عبداللہ عوام کے مرجع و امام بن گئے، پھر ان کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ ابن سعید اور ربیعہ ابن عبدالرحمن نے یہ حیثیت حاصل کی۔ مکہ میں عطاء ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی نے مسند امامت سنبھالی۔ اسی طرح حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں اور مکحول شام میں پیشوائے دین اور ترجمان شرع تسلیم کیے گئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں میں ان حضرات کے علوم و معارف کی پیاس پیدا کی اور انھیں ان علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ان علمائے کبار سے رسول اللہ کی حدیثیں، صحابہ کے اقوال و فتاویٰ اور خود ان کے اپنے مذاہب اور تحقیقات لے کر جمع کیں، پوچھنے والوں نے ان سے فتوے پوچھے، (زندگی کے بے شمار) مسائل ان کے سامنے آئے اور کتنے ہی معاملات ان کے روبرو پیش ہوئے۔ (جن میں انھیں فتوے دینے پڑے)

تدوین فقہ کی ابتدا سعید ابن مسیب اور ابراہیم نخعی وغیرہ نے باقاعدہ فقہ کے تمام ابواب جمع کیے۔ ہر باب میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتے تھے جن کو انھوں نے سلف سے حاصل کیا تھا۔

سعید ابن مسیب اور ان کے تلامذہ اس امر کے قائل تھے کہ حرمین کے باشندے تفقہ میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

اس لیے ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ اور احکام نیز حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتووں اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں پر قائم ہے۔ چنانچہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی انھوں نے ان احکام اور فتاویٰ کو جمع کیا۔ پھر ان پر بصیرت اور تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان کا جائزہ لیا، جس شے پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اس پر تو پوری مضبوطی سے جم گئے، اور جس چیز میں ان کا اختلاف دکھائی دیا اس کے متعلق وہ قول اختیار کر لیا جو زیادہ قوی اور راجح تھا۔ یہ قوت اور راجحیت خواہ کسی بنا پر ہو، چاہے اس بنا پر کہ اکثر علما کا اختیار کردہ قول ہے، یا اس بنا پر کہ وہ کسی مضبوط قیاس یا کتاب وسنت کے کسی صریح استنباط کے موافق پڑتا ہے، یا کسی اور بنا پر۔ اور جب ان لوگوں کو علمائے مدینہ سے حاصل کیے ہوئے مجموعہ فتاویٰ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تو ان کے فرمودات سے استنباط کرتے اور ان کے اقوال کے اشارات اور مقتضیات کا سراغ لگاتے۔ اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب کے متعلق مسائل کا انبار لگ گیا۔

ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کا خیال تھا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے فیض یافتگان فقاہت میں سب سے ممتاز ہیں جیسا علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی بڑا فقیہ ہے؟" نیز امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی سے فرمایا کہ "ابراہیم نخعی، سالم ابن عبداللہ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر عبداللہ ابن عمر کو صحابیت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں۔ رہے عبداللہ ابن مسعودؓ تو وہ تو عبداللہ ابن مسعود ہی ہیں، ان کا کیا پوچھنا۔" ان حضرات کے مسلک فقہی کی بنیاد حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت علی کے فتووں اور فیصلوں پر، نیز قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے اپنے مقدور بھر ان احکام و فتاویٰ کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جو سعید بن مسیب وغیرہ نے علمائے مدینہ کے آثار واقوال کے متعلق اختیار کیا تھا، نیز اس ذخیرہ سے اسی طرح مزید مسائل کی تخریج کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔ انجام کار ان کے پاس بھی فقہ کے ایک ایک باب میں بے شمار مسائل منضبط ہو گئے۔

سعید ابن مسیب فقہائے مدینہ کے نفس ناطقہ اور ان میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ اور ابراہیم نخعی فقہائے کوفہ کے ترجمان۔ جب یہ دونوں حضرات کسی کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ مسئلہ کسی کی طرف منسوب نہیں اور بہر حال ان کا اپنا ہی اجتہاد ہے، بلکہ ایسے مسائل بالعموم کسی نہ کسی فقیہ سابق سے اشارۃً یا صراحۃً ضرور منسوب ہوتے ہیں۔ بالآخر یہ دونوں اپنے اپنے قرب و جوار کے فقہا کا مرکز بن گئے جنھوں نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا، اس میں تفکر کیا اور اس سے مزید مسائل اور جزئیات نکالے۔

مذاہب فقہا کے اسبابِ اختلاف

تبع تابعین کا دور عہد تابعین کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے خدام علم دین کا ایک گروہ پیدا کر دیا تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو اللہ کے رسول کی زبان سے اس علم کے متعلق نکلا تھا کہ "آنے والی نسلوں میں سے ہر نسل کے عادل لوگ اس علم کے حامل ہوں گے۔" چنانچہ ان خدام نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ان علمائے تابعین سے، جن سے وہ مل سکے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، بیع و شرا وغیرہ ان تمام مسائل کے جو زندگی میں عام طور سے پیش آتے ہیں، مشروع طریقے اخذ کیے، رسول خدا کی حدیثیں نقل کیں، مختلف شہروں

قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے جمع کئے، مسائل دریافت کیے اور ان سارے امور میں بطور خود اجتہاد کیا، پھر ایک گروہ کے پیشوا اور امور شرعیہ میں مستند قرار پا گئے۔ یہ لوگ بھی اپنے اپنے شیوخ کے نہج پر چلے اور سلف کے اقوال و فتاویٰ کے اشارات اور مقتضیات معلوم کرنے میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا۔ لوگوں کو فتوے دیے، احکام سنائے، روایتیں بیان کیں اور علم سکھائے۔

ان علماء کا طرز فکر و استدلال اس طبقہ کے علماء کا طرز فکر بالکل ایک ہے جس کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ:

(۱) مسند اور مرسل[1] دونوں ہی قسم کی احادیث قابل تمسک ہیں۔

(۲) صحابہ و تابعین کے اقوال سے شرعی استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کے اقوال کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں: یا تو وہ فی نفسہ رسول اللہ صلعم سے نقل کی ہوئی حدیثیں ہیں جن کو انھوں نے (بعض مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے) مختصر کر کے موقوف[2] بنا لیا۔ چنانچہ جب ابراہیم نخعی نے آنحضرت کی محاقلہ[3] اور مزابنہ[4] سے ممانعت والی روایت بیان کی تو ان سے کہا گیا کہ کیا آپ کو اس کے سوا رسول اللہ کی کوئی حدیث (مرفوع) یاد نہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ "یاد کیوں نہیں ہے مگر میں حدیث مرفوع بیان کرنے کے مقابلہ میں یوں کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ "عبد اللہ نے یہ فرمایا ہے" یا "علقمہ کا یہ قول ہے"۔ اسی طرح شعبی سے جب ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس کی سند کو براہ راست پیغمبر صلعم تک پہنچایا جاتا ہے تو انھوں نے جواب دیا "ایسا کرنا ٹھیک نہیں بلکہ ہم کو زیادہ مناسب (اور محتاط) طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سند روایت کو صحابہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو وہ آنحضرت کی طرف منسوب نہ ہو سکے بلکہ صحابہ ہی پر ختم ہو جائے"۔ یا یہ اقوال کتاب و سنت کے نصوص سے ان کے اپنے استنباط کیے ہوئے احکام ہیں۔ یا پھر وہ ان کی اپنی اجتہادی رائیں ہیں (لیکن اس استنباط اور اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ) یہ نفوس قدسیہ ان امور میں طرز عمل کی جو خوبی اور فکر و رائے کی جو درستگی رکھتے تھے اس میں بعد کے آنے والے حضرات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، نیز وہ ان سے باعتبار زمانہ مقدم اور باعتبار علم افضل بھی تھے۔ اس لیے ان کے اقوال پر عمل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس میں دو رائیں ہوتیں، بجز اس صورت کے جبکہ ان میں خود اختلاف رائے ہو جائے اور حدیث نبوی ان کے اقوال کے بالکل مخالف واقع ہو۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں احادیث باہم مختلف ہوتیں تو یہ حاملین علم دین اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں یہ نظر آتا کہ صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل قرار دیا ہے، یا نسخ و تاویل کی کسی تصریح کے بغیر ہی اس کے ترک کر دینے اور اس پر عمل نہ کرنے پر متفق الرائے ہو گئے ہیں ــــ کہ اس کا مطلب بھی دراصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا ماؤل ہی قرار دینا ہے ــــ تو ان تمام صورتوں میں یہ علماء اقوال صحابہ کا اتباع کرتے اور اس حدیث کو وہی حیثیت اور وزن دیتے جو صحابہ کے یہاں پاتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کتے کے جھوٹے برتن کا حکم بیان کرنے والی حدیث[5] کے متعلق حضرت امام مالک کے منہ سے نکلی تھی کہ "یہ حدیث

---

[1] مسند وہ حدیث ہے جس کی سند بیان کی جائے اور مرسل وہ جس کی سند بیان کیے بغیر کوئی تابعی یا تبع تابعی یوں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یا ایسا کیا ہے۔

[2] موقوف، مرفوع کے بالمقابل حدیث کی ایک قسم کا نام ہے۔ مرفوع وہ روایت ہے جس میں تصریح ہو کہ حضور نے ایسا فرمایا ہے، اور موقوف وہ جس میں صحابی ایک بات کہے، اور صراحت کے ساتھ اسے حضور کی طرف منسوب نہ کرے۔ [3] محاقلہ کے معنی ہیں کہ خوشوں سمیت گندم کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض بیچا جائے یا کچی کھیتی بیچنا۔

[4] مزابنہ کے معنی ہیں درخت پر لگی ہوئی تر کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا۔ [5] حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھوؤ، اس کے بعد ایک بار مٹی سے مانجھ کر صاف کرو۔ (مترجم)

روایت تو ہوئی ہے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس پر فقہا کو عمل کرتے ہوئے نہیں پایا۔

(۴) اگر صحابہ اور تابعین کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا تو ہر عالم اس رائے اور مسلک کو اختیار کرتا جو اس کے اپنے شہر کے علما اور اس کے شیوخ کا مسلک ہوتا کیونکہ وہ ان کے اقوال کے سقم و صواب سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے مناسبت رکھنے والے اصولوں کا بہتر رازداں ہوتا، نیز اس لیے کہ اس کا دل اپنے اساتذہ کے فضل و کمال اور تبحر علمی سے زیادہ متاثر ہوتا چنانچہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ صحابہ عظام اور ان کے شاگردانِ جلیل مثلاً سعید ابن مسیب (جو حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے) اور عروہ، سالم، عطاء، عکرمہ اور عبیداللہ ابن عبداللہ وغیرہ کا مذہب اہل مدینہ کے لیے دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ قابل قبول و مستحق اتباع ٹھیرا، اس وجہ سے بھی کہ آنحضرتؐ نے مدینہ کے بڑے فضائل[1] بیان فرمائے ہیں اور اس سبب سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہا اور علما کا مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک علماء مدینہ کی شاہراہ سے ہٹ کر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت شرعی مانتے تھے۔ اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے جس کا نام ہے "باب فی الاخذ بما اتفق علیہ الحرمان"۔ یعنی جس بات پر اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو، اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کے بالمقابل حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کا مذہب اور حضرت علیؓ اور قاضی شریح اور شعبی کے فیصلے اور ابراہیم نخعی کے فتاویٰ اہل کوفہ کی نگاہ میں دوسرے اقوال و مذاہب کی بہ نسبت زیادہ مختار اور لائق اتباع قرار پائے۔ چنانچہ یہی بنائے ترجیح تھی جس کے اثر کے تحت علقمہ نے تشریک[2] کے مسئلہ میں مسروق کو زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ الفاظ کہے تھے کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم و تفقہ رکھتا ہے"؟ مسروق نے جواب دیا کہ نہیں، ایسا تو نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور دوسرے باشندگان مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا ہے (اس لیے میرا خیال ہوا کہ یہ جائز ہے)۔ الغرض ہر عالم کے نزدیک اس کے اپنے ہی شیوخ اور علمائے شہر کے اختیار کردہ اقوال مرجح اور قابل اخذ و اتباع ہوتے تھے۔ اگر اہل شہر کسی امر پر متفق ہوتے تو یہ علما اس کو دانتوں سے پکڑ لیتے۔ چنانچہ امام مالک ایسے ہی مسائل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "جس سنت میں (اہل مدینہ کا) کوئی اختلاف نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک ایسی اور ایسی ہے" (یعنی بالکل ثابت اور واجب العمل ہے)۔ اور اگر اہل شہر کسی مسئلہ میں مختلف الرائے ہوتے تو ان مختلف رایوں میں سے یہ حضرات اس رائے کو اختیار کرتے جو زیادہ مضبوط اور راجح نظر آتی۔ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی رائے مضبوط اور راجح ہے اس بات سے ہوتا کہ اکثریت کس طرف ہے، یا یہ کہ کونسا قول مضبوط قیاس پر مبنی ہے، یا یہ کہ کونسا مذہب کتاب و سنت کی تخریجات سے اوفق ہے۔ جہاں امام مالک یوں فرماتے ہیں کہ "یہ بات ان تمام باتوں میں سب سے بہتر ہے جو اس مسئلہ کے متعلق میرے علم میں آئی ہیں" تو دراصل اسی طریق فکر و طرز عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر اگر یہ علما صحابہ اور تابعین کے مجموعۂ اقوال میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو انہی اقوال کو بنیاد قرار دے کر اس سے استنباط کرتے اور ان کے اشارات و مقتضیات کی پوری جستجو کر کے جواب مسئلہ کا سراغ لگاتے۔

---

[1] آپ نے فرمایا تھا کہ "جلد ہی لوگ طلب علم کی خاطر سواریاں دوڑائیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی صاحب علم و فضل نہ پائیں گے۔"

[2] تشریک کا مطلب یہ ہے کہ مالک زمین اپنی زمین بٹائی پر کاشت کرنے کے لیے دوسرے کو دیدے۔ (مترجم)

مذاہب اربعہ کا ظہور یہی وہ طبقہ ہے جس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ فقہ پر کتابیں مرتب کی جائیں۔ چنانچہ مدینہ میں امام مالک اور محمد ابن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب نے، مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ نے، کوفہ میں امام ثوری نے اور بصرہ میں ربیع ابن صبیح نے فقہ میں مستقل کتابیں لکھیں۔ ان تمام حضرات کا طریقہ تدوین وہی تھا جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

امام مالک اور مذہب مالکی خلیفہ منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالک سے کہا کہ "میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کے متعدد نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھجوا دوں اور حکم دے دوں کہ سب لوگ بس انہی کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں۔" امام مالک نے جواب دیا کہ "اے امیرالمومنین! ایسا نہ کر، کیونکہ لوگوں میں (سلف کے مختلف) اقوال پھیل چکے ہیں اور (مختلف اقسام کی) حدیثیں ان تک پہنچ چکی ہیں۔ ان مختلف اقوال واحادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو اس کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ پس لوگوں کو آزاد چھوڑ دے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دے جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے۔"

بعض لوگوں نے اس قصہ کو منصور کے بجائے ہارون الرشید کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی روایت اس طرح کی ہے کہ ہارون نے امام مالک سے بطور مشورہ پوچھا کہ "کیا آپ کی موطا خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ تمام اختلافات چھوڑ کر اسی کے مطابق عمل کریں"۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ "ایسا نہ کرو (یہ اختلاف صحابہؓ کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے)، فروع میں صحابہ خود مختلف الرائے تھے اور وہ (اپنے مختلف مذاہب لیے ہوئے) اطراف ملک میں بکھر گئے اور ہر ایک کا طریقہ مختلف علاقوں میں اب چل پڑا ہے۔" یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا "اے ابو عبداللہؒ اللہ تم کو (حکمت و دین کی) اور زیادہ توفیق دے"۔ اس واقعہ کو امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔

امام مالک ان احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ اور بلحاظ اسناد وہ سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ نیز وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبداللہ ابن عمرؓ اور عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں شاگردوں[1] کے اقوال کے سب سے بڑے عالم اور جامع ہیں۔ اسی ہستی اور اسی جیسی دوسری مبارک ہستیوں کے ہاتھوں علم روایت و فتویٰ کی بنیاد پڑی۔ مسند علم وارشاد پر متمکن ہونے کے بعد امام موصوف نے روایت حدیث، افتاء اور افادہ علمی کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کے باعث آنحضرت کی اس پیشنگوئی کے مصداق سمجھے گئے کہ "زمانہ قریب ہے کہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں دوڑ دھوپ کریں گے، سو اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم وفضل نہیں پائیں گے۔" ابن عیینہ اور عبدالرزاق کا خیال ہے کہ یہ پیشنگوئی امام مالک پر صادق آتی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی اصابت رائے مسلم ہے۔ پھر امام مالک کے تلامذہ نے ان کی روایات اور مختارات کو اکٹھا کیا، ان کی تلخیص اور تنقیح کی، شرحیں بیان کیں، ان کے اصول و دلائل پر بحثیں کیں، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کی تخریج کی اور ان چیزوں کو لے کر یہ لوگ مختلف ممالک میں خصوصاً مغرب کی طرف

---

[1] ان شاگردوں کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) سعید ابن مسیب (۲) عروہ ابن زبیرؓ (۳) قاسم ابن محمد ابن ابوبکر صدیق (۴) ابوبکر ابن عبدالرحمٰن مخزومی (۵) خارجہ ابن زید ابن ثابت (۶) عبیداللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ مسعودی (۷) سلیمان ابن یسار ہلالی۔ (مترجم)

پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی مخلوق کو نفع پہنچایا۔ ہم نے مذہب مالکی کی جو اصلیت بیان کی ہے اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنی چاہتے ہو تو "موطا امام مالک" کو نظر غائر سے دیکھو۔ تم پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

امام ابو حنیفہ اور مسلک حنفی

امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم خیال علمائے تابعین کے مسلک پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور شاید ہی کبھی اس سے اختلاف و انحراف کرتے ہوں۔ اس مذہب کی بنیادوں پر مسائل کی تخریج کرنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ تخریجات کے طریقوں میں وہ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور انھوں نے اپنی پوری توجہ جزئیات کی توضیح و استنباط میں لگا رکھی تھی۔ اگر تم ہماری اس بات کی تصدیق چاہتے ہو تو امام محمد کی کتاب الآثار، عبد الرزاق کی جامع اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی مصنف میں سے ابراہیم نخعی کے اقوال چن کر جمع کر لو، پھر امام ابو حنیفہ کے مذہب سے ان کا مقابلہ کرو تو تم دیکھو گے کہ سوائے چند مقامات کے کہیں بھی اُن کا قدم ابراہیم نخعی کے جادۂ فقہی سے ہٹ کر نہیں پڑتا۔ اور یہ چند مقامات بھی ایسے نہیں ہیں کہ امام مذکور نے ان میں کوئی اپنی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ ان میں بھی دیگر فقہائے کوفہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے آگے موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ابو یوسف ہیں جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تھے۔ ان کا یہی منصب تھا جس کے باعث حنفی مذہب ہر چہار طرف پھیل نکلا اور عراق، خراسان اور توران کے حدود میں حکومت کا آئین قرار پا گیا۔

دوسرے شاگرد جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے تمام تلامذہ میں ممتاز اور حصول علم میں سب سے زیادہ انہماک رکھنے والے تھے، امام محمد بن حسن ہیں۔ انھوں نے پہلے تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف سے فقہ حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالک سے موطا پڑھی۔ اس کے بعد بطور خود تفکر شروع کیا اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلہ کا موطا سے مقابلہ کر کے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ (اختلاف کی شکل میں) صحابہ اور تابعین کے مذاہب و اقوال کی جستجو کی، اگر کسی گروہ کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں وہ مذہب حنفی پر قائم رہے، لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہو تو ایسی حالت میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کر لیا جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ فائق اور مرجح نظر آیا۔

امام ابو حنیفہ کے ان دونوں تلامذہ نے بھی ابراہیم نخعی کے مذہب کی حتی الامکان اسی طرح پیروی کی جس طرح امام ابو حنیفہؒ نے کی تھی۔ صرف دو نقطہ ہائے اختلاف تھے جو استاد اور ان کے تلامذہ کے مابین واقع ہوتے تھے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ امام ابو حنیفہ نے ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا۔ اور کبھی یہ صورت ہوتی کہ ابراہیم نخعی وغیرہ فقہائے کوفہ کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال ہوتے تو ان اقوال میں سے کسی ایک قول کو سند انتخاب و ترجیح دینے میں یہ دونوں، امام موصوف کی مخالفت کر جاتے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، امام محمد نے تصنیف و تدوین کی طرف توجہ کی اور ان تینوں فقہا کے اقوال اکٹھے مرتب کیے، جس سے

بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ پھر بعد کے علمائے حنفیہ امام محمد کی ان تصانیف کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ ان کو چھانٹا اور صاف کیا۔ ان کے مطالب کی وضاحت کر کے ان کو قریب الفہم بنایا۔ ان کی بنیاد پر مزید مسائل کا استنباط کیا اور ان کو دلائل سے مبرہن کیا۔ پھر یہ لوگ (ان تمام تصانیف کو لے کر) خراسان اور توران کی طرف جا نکلے اور ان تصانیف کے سارے مسائل امام ابوحنیفہ کا مذہب کہے جانے لگے۔ اس طرح امام ابویوسف اور امام محمد کے مذاہب بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ساتھ مل گئے اور ان سب کو ایک ہی مذہب شمار کیا گیا، حالانکہ یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابوحنیفہ سے ان کے اختلافات کی فہرست کافی طویل ہے۔ نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا اصل ان تینوں میں مشترک ہے (یعنی یہ تینوں ہی حضرت ابراہیم نخعی کے مذہب کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں۔) اور دوسرے یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں مذاہب کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

امام شافعی اور مسلک شافعی | ان دونوں مذاہب، مذہب مالکی اور مذہب حنفی ــــ کی شہرت و اشاعت اور ان کے اصول و فروع کی ترتیب کا آغاز تھا کہ اس بزم میں ایک تیسرے امام، امام شافعی تشریف لائے۔ آپ نے اگلے لوگوں کے طریق فکر و استنباط کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس میں ایسی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں جنھوں نے ان کو اس راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا۔ ان باتوں کا ذکر امام موصوف نے اپنی تصنیف "کتاب الام" کے ابتدائی اوراق میں (بڑی وضاحت سے) کیا ہے۔ ان کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے:-

(۱) یہ لوگ (فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ) مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پا لیتی ہیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے (اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں۔ اس لیے امام شافعی نے فیصلہ کیا کہ مرسل روایتوں کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ ان شرطوں کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔

(۲) ان حضرات کے ہاں مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قواعد منضبط نہ تھے جس کے باعث ان کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعی نے پہلے یہ اصول و قواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔ اس امر کی مثال (کہ امام شافعی کے خیال کے مطابق پچھلے فقہا کے اجتہادات اصول تطبیق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے تھے) اس واقعہ میں موجود ہے کہ ایک دن امام شافعی امام محمد کے ہاں آئے۔ امام محمد اپنی تقریر میں فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ یہ لوگ فصل مقدمات کے لیے دو گواہوں کی شہادت ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف ایک ہی گواہ کی گواہی اور مدعی کی قسم پر بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ ہے[1]

---

[1] اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قرآن کے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی ترمیم یا تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہی شہادت کا مسئلہ ہے جس کی بابت قرآن میں عام حکم ہے کہ فصل مقدمات کے لیے دو شاہد چاہییں۔ مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شاہد مہیا نہ ہو سکیں تو مدعی کی قسم اور ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہے۔ گویا حلف دوسرے گواہ کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ (مترجم)

امام شافعی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ "کیا آپ کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز نہیں؟" انھوں نے فرمایا کہ "ہاں"۔ امام شافعی نے کہا "تو پھر آپ حدیث لا وصیة لوارث کو لے کر، جو ایک خبرِ واحد ہے، یہ کیوں کہتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، حالانکہ کتاب اللہ کہتی ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (تم پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو وہ اگر اس نے مال چھوڑا ہو۔ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر دے) کیا یہ خبرِ واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ نہیں ہے؟" اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کے اور بھی چند اعتراضات امام محمد پر کیے، جن کے جواب میں امام محمد کو انجام کار خاموش ہونا پڑا۔

(۳) وہ علمائے تابعین، جن کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد تھی، بعض صحیح حدیثوں سے لاعلم تھے اس لیے انھوں نے مسائل پیش آمدہ میں یا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا یا عام خیالات کو لے لیا یا اگلے صحابہ کے طرزِ عمل کو اختیار کر لیا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیدیا پھر کبھی ایسا ہوا کہ آگے چل کر تیسرے طبقہ میں وہ حدیثیں منظرِ عام پر آئیں لیکن پھر بھی ان فقہا نے ان کو چھوڑے ہی رکھا اور ان پر صرف اس خیال سے عمل نہیں کیا کہ یہ حدیثیں ہمارے علمائے شہر کے عمل اور مذہب کے جس سے ہم کوئی اختلاف نہیں رکھتے مخالف ہیں، اور یہ مخالفت بتاتی ہے کہ ان حدیثوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور علت ضرور موجود ہے جس نے ان کو مرتبہ قبول اور پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ یہ احادیث تیسرے طبقہ میں بھی شہرتِ عام حاصل نہ کر سکیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں میں مشہور ہوئیں جبکہ علمائے حدیث نے اسناد و طرقِ حدیث کو جمع کرنے میں پوری کاوش دکھلائی اور اس کے لیے زمین کا ایک ایک گوشہ چھان کر اربابِ علم کا کھوج لگایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ایک یا دو سے اوپر نہیں، پھر ان صحابہ سے یہ حدیثیں سن کر دوسروں سے بیان کرنے والے بھی دو ہی ایک آدمی ہیں، اور اسی طرح آگے تک راویوں کی یہ قلت تعداد چلی گئی جس کے سبب سے یہ احادیث عام اہلِ فقہ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئیں اور ان حفاظِ حدیث کے زمانہ میں پردۂ خفا سے باہر نکلیں جنھوں نے حدیث کو ان کے طرق و اسانید کے ساتھ جمع کیا۔ پھر ایک دوسری شکل یہ بھی تھی کہ کتنی ہی حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک خاص خطۂ ملک کے لوگ ہیں، مثلاً اہلِ بصرہ نے ایک حدیث روایت کی اور باقی تمام دیگر مقامات کے لوگ ان سے بالکل بے خبر رہ گئے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ علمائے صحابہ و تابعین کا برابر یہ دستور رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو پہلے وہ رسول اللہ کی حدیث تلاش کرتے، اگر کوئی حدیث نہ ملتی تب جا کر کسی اور طریقۂ استدلال سے کام لیتے۔ مگر اس کے بعد بھی قبولِ حدیث کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے تھے بلکہ بعد میں جب بھی کوئی حدیث ان کو مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو ترک کر دیتے اور حدیث کو اختیار کر لیتے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو ان علماء کا کسی حدیث سے تمسک نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حدیث ہی کمزور ہے۔ الا آنکہ انھوں نے صراحت کے ساتھ اس کی تضعیف اور تنقیص کر دی ہو۔ حدیث "قلتین"[1] اس کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے جو بہت سی سندوں سے مروی ہے، جن میں سے اکثر کا سررشتہ اس سلسلہ روایت سے بندھتا ہے کہ یہ حدیث ولید بن کثیر نے محمد ابن جعفر ابن زبیر سے یا محمد ابن

[1] اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ اذا كان الماء قلتين لم يحمل خبثا۔ یعنی جب پانی دو "قلہ" ہو تو وہ کسی نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔
"قلہ" اس بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پانی آسکے، یا بقول بعض دو مشک پانی۔ (مترجم)

عباد ابن جعفر سے روایت کی اور انھوں نے عبید اللہ ابن عبد اللہ سے نقل کی اور عبید اللہ نے ابن عمرؓ سے بیان کی۔ بعد میں چل کر اس سلسلۂ اسناد سے شاخ در شاخ بہت سے سلسلہ ہائے سند پیدا ہوگئے۔ یہ دونوں راوی (محمد ابن جعفر اور محمد ابن عباد) اگرچہ پوری طرح قابل اعتبار ہیں مگر یہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو فتویٰ دینے کے منصب پر سرفراز اور مرجع عوام تھے اس وجہ سے یہ حدیث نہ تو سعید ابن مسیبؒ کے زمانہ میں مشہور ہوسکی نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں، اور نہ تو مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے۔ مگر امام شافعیؒ کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہوچکی تھی، اس لیے انھوں نے اس کو قابل عمل ٹھیرایا۔

ایک اور مثال "خیار مجلس"[1] والی حدیث کی لے لو جو ایک صحیح حدیث ہے اور بہت سے طریقوں سے روایت ہوئی ہے اور صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ لیکن "فقہائے سبعہ" اور ان کے ہم عصر دوسرے علما تک نہ پہنچ سکی، اس لیے انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا اور یہ چیز امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدیث میں قدح کی علت بن گئی، لیکن امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابہ کے اقوال امام شافعی کے زمانہ میں کثرت سے اکٹھا ہوئے جن میں کافی اختلاف اور انتشار تھا۔ آپ نے ان پر تنقید و تحقیق کی نگاہ ڈالی تو ان کا ایک بڑا حصہ احادیث صحیحہ کا مخالف نظر آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کو یہ حدیثیں پہنچی ہی نہ تھیں۔ پھر علمائے سلف کو دیکھا کہ اس معاملہ میں وہ برابر اقوال صحابہ کو چھوڑ کر احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ان اقوال کو تو قابل حجت و عمل مانا جن پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ مگر باقی کو لائق تمسک تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "صحابہ بھی انسان تھے اور ہم بھی (انہی کی طرح کے) انسان ہیں"[2]۔

(۵) امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا کا ایک گروہ "رائے" کو، جس کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا ہے، قیاس کے ساتھ، جس کو شریعت میں اعتبار کا مقام حاصل ہے، گڈمڈ کر رہا ہے اور ان میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ یہ لوگ اس "رائے" کو کبھی استحسان بھی کہتے ہیں ــــــ "رائے" سے میری مراد یہ ہے کہ کسی نقصان یا کسی مصلحت کے مظنہ کو کسی حکم کی علت ٹھیرا دیا جائے، اور قیاس یہ ہے کہ ایک حکم منصوص کی علت دریافت کی جائے اور اس علت کی بنا پر دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے۔ امام شافعی نے فقہا کے اس طرز عمل کا پوری قوت سے ابطال کیا اور کہا کہ "جو استحسان یعنی رائے سے کام لیتا ہے وہ دراصل شارع بننا چاہتا ہے"۔ اس قول کو عضدؔ نے "مختصر الاصول" کی شرح میں درج کیا ہے۔ اس کی مثال "رُشد یتیم" کا مسئلہ ہے۔ یتیم کا معاملہ فہم ہوجانا ایک مخفی امر ہے (جس کے لیے کوئی متعین تاریخ نہیں بتائی جاسکتی) لیکن فقہا نے یہ دیکھ کر بالعموم پچیس سال کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آجاتی ہے، اس "مظنۂ رشد" (یعنی پچیس سالہ عمر) کو اس کا قائم مقام قرار دے کر یہ اصول بنا دیا کہ "جب یتیم کی عمر پچیس سال کی ہوجائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے"۔ اور کہا کہ یہ "استحسان ہے"۔ اس کے بالمقابل اس مسئلہ میں قیاس یہ ہے کہ مال

---

[1] وہ حدیث یہ ہے کہ "جب تک خریدار اور فروخت کنندہ باہم الگ نہ ہوجائیں، اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو معاملۂ بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

[2] یعنی ہماری ہی طرح وہ بھی فہم و نظر کی فطری لغزشوں سے مامون نہ تھے کہ ان کے اقوال کو ایک نبی معصوم کے کلام کی طرح آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ نصوص کتاب و سنت سے جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں، ان کے استنباط کے ہم پابند کیوں ہوں۔ (مترجم)

اس کو سپرد نہ کیا جائے (تا وقتیکہ وہ واقعۃً معاملہ فہم اور صاحب عقل و رشد نہ ہو جائے)۔

مختصر یہ کہ جب امام شافعی نے اپنے پیشروؤں میں اس قسم کی باتیں دیکھیں تو (ان سے نامطمئن ہو کر) انھوں نے علم فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور بطور خود اس کے اصول مرتب کیے اور ان اصولوں پر جزئیات کا استنباط کیا، اس فن پر مستقل اور بہترین کتابیں لکھیں جو لوگوں کی فیضیابی کا ذریعہ بنیں۔ فقہائے وقت آپ کے ارگرد جمع ہو گئے اور آپ کی تصنیفات کو لے کر ان کا اختصار کیا، ان کی شرحیں لکھیں، ان سے دلیلیں اخذ کیں اور ان کو سامنے رکھ کر مزید مسائل مستنبط کیے۔ پھر (ان سب چیزوں کو لے کر) مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ اس طرح یہ فقہ کا ایک الگ اسکول قرار پایا جس کی نسبت امام شافعی کی طرف تھی۔

(باقی)

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	حصہ اول	۱ر عہ	مجلد	۲ر ۸
" " "	" دوم	۱ر ۸	"	۲ر ہے
تفہیمات		۸ر ہے	"	۱ر للعہ
خطبات	قسم اول	۱ر ۸	"	۲ر ہے
"	" دوم	۱ر عہ		
رسالہ دینیات	" اول	۱ر عہ	"	۱ر ۸
" "	" دوم	عہ		
مسئلہ جبر و قدر		عہ		
تجدید و احیائے دین		عہ	"	۱ر عہ
پردہ		۱ر ۸	"	۲ر ہے
حقیقت توحید		۱ر عہ	"	۱ر عہ
روداد جماعت اسلامی	" دوم	۹ر		
" "	" سوم	عہ	"	۱ر عہ
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	ہر سہ حصہ		"	صعہ

نوٹ:- جن کتابوں کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔ وہ ختم ہو چکی ہیں۔
مجلد کتب پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ "مینیجر"

حضرت موسیٰؑ نیشنلسٹ لیڈر تھے
یا
نبی اور رسول؟

ہمارے ایک رفیق نے کسی عالم دین کی ایک تحریر یا تقریر کے کچھ اقتباسات ہم کو بھیجے ہیں اور ان پر چند سوالات کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اور سوالات یہاں نقل کرکے ہم ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباسات یہ ہیں:-

"بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گذر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل گیا ہے) اس کے "حد سے نکل جانے" کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا"

"ادھر جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے ہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جاکر کہو اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے) تو آیت سے صراحتاً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لیے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھیرتی؟"

"ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہوگئی کہ مسلمانوں کے لیے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے، نہ اقتصادیات کا، نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا، نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا، بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے"۔

"بس یہی موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا، نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ "توجہ فرمائی" جس سے مالی حالت درست ہوتی اور نہ ادبی امور کی طرف "زیادہ" التفات فرمایا جن سے حیثیت وعزت کو تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ تاکہ یہ "آزادانہ" زندگی بسر کرسکیں اور اپنی "مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود" کرنے پر قادر ہوجائیں"۔

"پس آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند ہی سے متعلق ہے .... پس مسلمانوں کے لیے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے انھیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے"۔